© rasailojaraid.com

اداریہ

اندیشۂ جہاد

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

جہاد اسلام کی ان تعلیمات میں سے ایک ہے جسے مغرب ہی نہیں خود مسلمانوں نے ہر دور میں عصری تقاضوں کے پیش نظر تعبیر کی چھلنی سے گزارنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اس کی ایسی ایسی نادر تعبیرات پیش کیں جو شاید قرن اول کے کسی مجتہد کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گی۔ ان خدشات، غلط فہمیوں، فکری غلطیوں اور اندیشوں میں سب سے نمایاں پہلو جہاد کی ''غارت گری'' کا تصور ہے جسے گزشتہ دو دہائیوں میں عملی سطح پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا رہا ہے*۔

یورپی کلیسا نے صدیوں قبل (۱۰۹۱-۱۲۹۱ء) مسلمانوں اور یہودیوں کو تلوار کے ذریعہ عیسائی بنانے کے لیے جن صلیبی جنگوں کا آغاز کیا تھا ان کی تمام غارت گری کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے دور جدید کے اکثر مغربی مستشرقین قرآن کے تصور جہاد کو مناسب اور معروضی تحقیق و تقابل کے بغیر بایک جنبش قلم قوت کے اندھے استعمال، بربریت، تشدد اور غارت گری سے تعبیر کر بیٹھتے ہیں اور پھر ان تعبیرات کو اتنی تکرار کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے کہ نہ صرف عامۃ الناس بلکہ غیر مسلم اور مسلم دانش ور بھی، بغیر ضمیر کی کسی خلش کے اکثر ان ہوائیوں پر ایمان لے آتے ہیں۔ علمی حلقوں میں اس تصور کے دو واضح ردعمل سامنے آتے ہیں۔

---

* Rudolph Peters, *Jihad in Classical and Modern Islam,* Princeton, Marks Wiennr Pubishers, 1996; Jones Turner Johnson, *The Holy War Idea in Western and Islamic Traditions,* University Park, the Pennsylvania State University Press, 1997. ; Natana J. Delong,Bar, *Wahhabi Islam: From Revival and Reforom to Global Jihad,* Oxford, Oxford University Press 2004; Adam Gorfinkle ed. *A Practical Guide to Winning the War on Terrorism,* Stanford, Hoorn Press, 2004; Ray Takeyh and Nicolas K. Cavosdev, *The Receding Shadow of the Prophet: The Rise and fall of Radical Political Islam,* Westport, Ct, Praeger, 2004

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلے کا تعلق ذہنی مرعوبیت سے ہے اور اس ردعمل میں بار بار دہرائی ہوئی ایک بات سے متاثر ہو کر معذرت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے جہاد و قتال کو ماضی کی ایک روایت قرار دیتے ہوئے اپنی ''روشن خیالی'' کی ڈفلی بجا بجا کر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم تو اصل میں بہت امن پسند بلکہ ''اہمسا'' کے علمبردار ہیں ہم ایک چیونٹی کے ملنے کو بھی حیوانی حقوق کی پامالی سمجھتے ہیں۔ اسلحہ کا استعمال صرف اپنے دفاع کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ اگر کسی خطہ میں انسانوں کے حقوق پامال ہو رہے ہوں ان کا خون ناحق بہایا جا رہا ہو انہیں مستضعفین فی الارض بنا دیا گیا ہو تو یہ ان کا مسئلہ ہے۔ ہم حد سے حد ان کے لیے دعا کر سکتے ہیں۔ ان کی امداد اور انہیں ظلم سے نجات دلانا ہمارا نہیں بلکہ خالق کائنات کا مسئلہ ہے!

دوسرا ردعمل یہ سامنے آتا ہے کہ اسلام تو نام ہی مشرکین اور کافرین سے زمین کو پاک کرنے کا ہے۔ اس لیے انہیں جہاں پایا جائے بلا تکلف و تردد قتل کر دیا جائے اور آخر کار زمین پر صرف مسلمان باقی رہ جائیں۔ اس نوعیت کی نادر تعبیرات کو عموم کا درجہ دے کر ان پر ایک عالیشان تصوراتی محل تعمیر کر دینا زمینی حقائق کے ساتھ ایک صریح زیادتی ہے۔

کیا قرآن کا دیا ہوا تصور جہاد ہر دور میں تبدیل ہوتا رہا ہے۔ یہ ایک تحقیق طلب سوال ہے۔ لیکن اس پر غور کرنے سے قبل ہمیں یہ تعین کرنا ہوتا کہ عصری مغربی مستشرقین کی اصل ذہنی الجھن کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ چند سوالات جو بار بار اٹھائے جاتے ہیں یہ ہیں:

۱۔ کیا اسلام تشدد، غارت گری اور سوچی سمجھی ہلاکت (organized use of violance) کی اخلاقی اور قانونی توثیق کرتا ہے۔

۲۔ کیا اسلام جہاد کو حرب مقدس (Holy War) کا درجہ دیتا ہے۔

۳۔ کیا جہاد کا مقصد سیاسی توسیع ہے اور یہ محض ریاست کی حدود بڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ پوری دنیا پر صرف مسلمانوں کا تسلط ہو جائے۔

۴۔ کیا اسلام اور قوت و تشدد کے استعمال میں کوئی منطقی اور فکری تعلق ہے۔

۵۔ کیا جہاد کا مقصد مسلم دنیا اور غیر مسلم دنیا پر شریعت کو مسلط (impose) کرنا ہے۔

۶۔ کیا جہاد جنت کے حصول کا آسان، مختصر اور یقینی راستہ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۷۔ کیا اسلام انسانی تباہی کے آلات (WMD) کو مباح قرار دیتا ہے۔

یہ وہ چند بنیادی سوالات ہیں جن کے مفروضہ جوابات عصری مغربی مستشرقین کی تحریرات میں پیش کیے جا رہے ہیں اور جن کی ایک جھلک Quinlan Wiktorowicz اور Mark Gould کے مقالات میں نظر آ رہی ہے۔ اوپر ذکر کیے گئے معذرت پسندانہ اور جارحانہ ہر دو طریقوں سے خود کو بچاتے ہوئے ہم چاہیں گے کہ تعلیمی حکمت عملی (education approach) کو اختیار کرتے ہوئے ان سوالات کا ایک اصولی (in prenciple) جائزہ لیا جائے، جو ہمارے اور دوسروں کے لیے اصولی رہنمائی کی بنیاد بن سکے۔

گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے یہ بات واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ قرآن کریم محض چند ''جامد'' قوانین (precepts, commands. devine law) تک محدود نہیں ہے بلکہ تین واضح انواع پر مشتمل ہے یعنی احکام، اصول اور تعلیمات و ہدایات جہاں تک احکام کا تعلق ہے وہ متعین ہیں جن میں حدود، معاملات اور عبادات کے حوالے سے تشریح کر دی گئی ہے۔ یہ احکام قرآن کریم میں موجود بعض اصولوں پر مبنی ہیں مثلاً قصاص کے حکم کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ انسانی جان کا بچانا اصل ہے اور جو اسے ضائع کرے اس کی تعزیر اور دوسروں کی تعلیم کے لیے جان کے بدلے جان لی جائے گی۔ لیکن احکام کے ساتھ بعض اوقات تعلیم کو حکم سے ملحق اور بعض اوقات الگ بیان کر دیا گیا۔ مثلاً قتل کے حوالے سے نص کو بیان کرتے ہوئے تعلیم کر دی گئی ہے کہ اگر ایک متاثر خاندان قاتل کو معاف کر دے تو بڑے اجر کی بات ہے یا خون بہا وصول کر لے تو یہ اس کا حق ہے لیکن اگر وہ اس تعلیمی انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے حق پر اصرار کرے اور قاتل کی جان قانونی اداروں کے ذریعہ بدلہ میں لی جائے تو یہ بھی قانونی روایت کے مطابق ہوگا۔ اس لیے بعض مغربی اور بعض مسلم مستشرقین کا یہ کہنا کہ اسلام میں precepts یعنی principles کی کمی ہے (Gould, p 25-26) قرآن شناسی سے ناواقفیت کی ایک علامت ہے۔

انسانی جان کے احترام اور تحفظ و بقاء کو فقہاء اسلام نے شریعت کا پہلا مقصد قرار دیا ہے اور قرآن کریم نے جا بجا یہ بات بیان کی ہے کہ جس نے ایک انسانی جان کو ناحق ضائع کیا اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک انسانی جان کو بچایا اس نے تمام انسانوں کو حیات بخشی۔ یہ اصول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہب، رنگ، نسل، ذات ہر قسم کی تقسیم سے بلند ہو کر تمام انسانوں کے لیے ایک ایسے اصول کا اعلان کرتا ہے جس کا ماننا کسی مسلمان کے مسلمان ہونے کی شرط ہے۔ اگر واقعی ''بنیاد پرست'' کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے دین کی کتاب کو لفظاً لفظاً مانتا ہو تو جو جتنا زیادہ ''بنیاد پرست'' ہو گا وہ اتنی ہی شدت سے اس اصول پر کاربند ہو گا۔ ورنہ اس کے ایمان کے بارے میں سوال اٹھے گا کہ وہ قرآن کو مانے بغیر کس قسم کا مسلمان ہے۔

بلاشبہ اس اصول کو دو ٹوک انداز میں پیش کر دینے کے ساتھ قرآن کریم نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ کون سا خون بہانا حق کی پیروی میں ہو گا۔ چنانچہ سورۃ الحج کی آیت ۳۹-۴۰ میں کہا گیا ''اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے، اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو خانقاہیں، گرجا، معبد اور مساجد جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔۔۔'' (الحج ۲۲:۳۹-۴۰)۔

یہاں عیسائیت کے just war کے تصور سے ہٹ کر ایک نئی فکر انقلابی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ معاملہ کسی ایک ''مذہب'' کے ماننے والوں کے تحفظ یا کسی ایک مذہب کا دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے قوت کے استعمال کا نہیں ہے بلکہ کم از کم چار مذہبی روایات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بات فرمائی جا رہی ہے کہ وہ عیسائیوں کے گرجے ہوں، یہودیوں کے معبد ہوں یا بدھ اور دیگر مذاہب والوں کی خانقاہیں یا مسلمانوں کی مساجد، ان تمام علاماتی مراکز عبدیت کے تحفظ، آزادی اور بلا روک ٹوک ان میں جا کر اپنے مسلک کے مطابق اپنے رب کو یاد کرنے کے حق کا دفاع جہاد کا بنیادی مقصد ہے۔ یہ وہ انقلابی تصور ہے جسے ایک عیسائیت سے مرعوب ذہن اور نگاہ عموماً محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، چونکہ اس کا بنیادی ذہنی ڈھانچہ Atonement، salvation، redemption اور grace کے شہتیروں سے تعمیر ہوتا ہے اس لیے وہ اسلام میں بھی ان تصورات کے متبادل نظریات کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور محض ظاہر مماثلت کو حقیقی اشتراک سمجھ کر نتائج تک چھلانگ لگا کر اپنے مفروضوں کے درست ہونے پر شاداں و فرحاں اور مطمئن ہو بیٹھتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سورۃ الحج کی مندرجہ بالا آیت سے جو اصول نکلتا ہے وہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے مقامات عبادت ان کی ثقافت و تہذیبی زندگی کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں proceletyzation کے تصور کا سایہ بھی آس پاس نظر نہیں آنے پاتا۔ اس سے زیادہ حقوق انسانی کا احترام اور دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری کا طرزِ عمل نہ تو عیسائیت نے آج تک پیش کیا ہے اور نہ کسی اور مغربی یا مشرقی مذہب نے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن جہاد کو ایک فریضہ قرار دیتا ہے۔ اگر جہاد کے وسیع تر تصور کو، جس کا ایک پہلو اوپر پیش کیا گیا، دین سے خارج یا معطل یا ملتوی کر دیا جائے تو پھر بین المذاہبی رواداری اور دینی و ثقافتی حریت کے اصول کو بھی خیر باد کہنا ہوگا۔

جہاد کی تمام تر فرضیت و اہمیت کے باوجود قرآن و حدیث نے اس کے لیے جو اصطلاح استعمال کی وہ ''اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں انتہائی کوشش'' کی ہے۔ اسلامی تاریخ میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جب کسی فقیہ یا مفسر و محدث نے جہاد کے لیے Holy War یعنی حرب المقدس کی اصطلاح استعمال کی ہو۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس تصور کو خالصتاً عیسائیت سے منسوب کیا ہے اور بتایا ہے کہ پاپائے روم نے یہودیوں اور مسلمانوں کو قوت کے استعمال کے ذریعہ عیسائی بنانے کے لیے تمام عیسائیوں کو حروب الصلیبی کے عنوان سے جمع کیا اور یہی صلیبی جنگیں (holy war) کہلائیں (Macropedia, Chicago, 1974, v.5, p. 297-310)۔

اسلام کے قانون صلح و جنگ میں کسی مقدس جنگ کا تصور نہ پہلے تھا نہ آج پایا جاتا ہے۔ چونکہ اسلام زندگی کو لادینی اور دینی خانوں میں تقسیم نہیں کرتا اس لیے اس کی جنگ ہو یا رزقِ حلال کا حصول، شعر و شاعری ہو یا صنعت و حرفت ہر سرگرمی کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے بچنا ہے۔ اس لیے دین کا دائرہ کار اور لادینی اعمال کا دائرہ کار الگ الگ نہیں ہے۔ مغربی تعلیم یافتہ ذہن اور خود مغرب کا مادہ پرست تہذیب کا پیدا کردہ ذہن چونکہ اسلام کو یورپی مذہبی عینک سے دیکھتا ہے اور مسجد جانے کو مذہبی سرگرمی جبکہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے کو سیکولر اور پیشہ ورانہ سرگرمی قرار دیتا ہے۔ یہ تقسیم اسلام کے لیے اجنبی ہے۔ گو بہت سے مسلمان صدیوں سے اس پر عمل کرتے چلے آ رہے ہیں اور اپنے خیال میں کمال مہارت سے ''دین و دنیا'' میں توازن پیدا کر کے بیک وقت مسجد جا کر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کاروبار کے دائرے میں سرمایہ داری کے خدا کو بیک وقت خوش رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے جب یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا بہت سے الہ بہتر ہیں یا ایک اللہ وحدہ لاشریک، کیا بہت سے حاکمیتیں بہتر ہیں یا حکم صرف اللہ کے لیے ہونا بہتر ہے تو اس سوال کا اصل مقصد اس تقسیم کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا تھا۔ ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں holy war کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ یہ بنیادی طور پر ایک عیسائی تصور ہے جسے اسلام پر چسپاں کرنا قرآن وسنت کی تعلیمات کی روح کے منافی ہے۔

قرآن کریم نے جہاد کا مقصد ظلم وتعدی، ناانصافی، فتنہ وفساد، قتل وغارت اور بدامنی کو دور کرنا قرار دیا ہے۔ کیونکہ قرآن کی نگاہ میں فتنہ قتل سے زیادہ شدید ہے اور جب تک کسی معاشرہ سے ظلم وناانصافی دور نہ ہو وہاں عدل کا قیام نہیں ہوسکتا۔ جہاد فی الحقیقت معاشرتی، معاشی اور سیاسی عدل کے قیام کا ذریعہ ہے یہ جہاد جہاں ضرورت ہو قلم سے ہوگا اور جہاں ضرورت پیش آئے اسلحہ سے ہوگا۔ کہیں اس جہاد کا اسلحہ تعلیم وتربیت ہوں گے کہیں جدید ترین عسکری ایجادات۔ گویا جہاد محض عسکری جدوجہد کا نام نہیں بلکہ اس مجموعی اور اجتماعی عمل کا نام ہے جو معاشرہ کی اصلاح اور بقائے حیات کے لیے فاسد مادوں کو دور کر کے فضاء کو صحت مند، سازگار اور عدل وامن کا مرکز بنادے۔

حقوق انسانی کی بحالی اور تحفظ اس کا ایک بنیادی محرک ومقصد ہے۔ قرآن کریم نے اس پہلو کو انتہائی واضح اور متعین الفاظ میں یوں بیان کیا ہے: ''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں کی خاطر جنگ نہ کرو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی ومددگار پیدا کردے'' (النساء۴: ۷۵)۔

ظلم، استحصال اور حقوق انسانی کی پامالی کو دور کرنا اسلام کی نگاہ میں ایک عظیم انسانی خدمت ہے اس ظلم کا نشانہ بننے والے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اصلاح حالت کے لیے اہل ایمان پر جہاد کو فرض کردیا گیا ہے۔ گویا جہاد نہ صرف اہل ایمان بلکہ انسانوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ نتیجتاً ترکِ جہاد کا واضح مطلب طاغوت اور ظلم کے اہلکاروں کو مظلوموں کے خون، عزت اور مال سے کھیلنے کی آزادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فراہم کرنا ہوگا۔ اس حیثیت سے جہاد ایک تحفظ (deterrance) فراہم کرتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر قرآن نے یہ بات کہی ہے کہ تم اپنے گھوڑں کو تیار رکھو اور اپنی قوت واتحاد کو اتنا مضبوط بنالو کہ ظلم وکفر کی قوتیں تمہارے سامنے سر نہ اٹھاسکیں۔ اور بغیر کسی قوت کے استعمال کے وہ محض اس دباؤ کی بنا پر اللہ کے بندوں پر زیادتی سے باز رہیں۔

جہاد اور قتال کی اصطلاحات اور ان کے قرآن کریم میں استعمال سے ناواقفیت کی بنا پر ان دونوں اصطلاحات کو تشدد، غارت گری اور انتہاپسندی سے وابستہ کر کے بعض عمومی نتائج نکال لیے گئے ہیں اور انہیں اس کثرت سے ابلاغی ذرائع، علمی تحریرات اور سیاسی بیانات میں نشر کیا جارہا ہے کہ وہ سادہ لوح افراد بھی جو قرآن سے کچھ واقفیت رکھتے ہوں ان تعبیرات کو سن کر معذرت پسندانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور جہاد کو دفاعی جنگ قرار دے دیتے ہیں جبکہ قرآن وسنت نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور فتنہ وفساد اور ظلم کو رفع کرنے کے لیے جہاد کو ایک فریضہ قرار دیا ہے۔ گویا یہ ایک Reactive حکمت عملی نہیں ہے بلکہ ایک pro-active تعلیم ہے۔ جس کا مقصد معاشرہ میں امن کا قیام، عدل کی سربلندی اور بغاوت، سرکشی، عدم تحفظ اور ظلم کا ابطال ہے۔ یہ ایک اخلاقی اور انسانی مطالبہ ہے۔ جس کے لیے کسی کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔ اسی لیے مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی جو بین الاقوامی معاہدہ مسلمانوں اور یہود کے درمیان ہوا اس میں یہود نے بھی ریاست میں امن کی بقاء اور بیرونی خطرے کے مقابلہ کی شکل میں جہاد میں شرکت کرنے اور اخراجات میں اپنا حصہ ادا کرنے کا تحریری معاہدہ کیا تھا۔ گویا اہل ایمان کی طرح وہ بھی جان اور مال سے جہاد میں شرکت کے لیے آمادہ و پابند ہوئے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہود اور مسلمانوں کے اصولی طور پر جہاد میں شامل ہونے کا مقصد مشرکین کو بزور قوت مسلمان بنانا prozlytization نہیں تھا بلکہ ظلم کے خلاف یکجہتی کا اظہار تھا۔

اسلام کے سیاسی کردار کو عموماً مسلح قوت کے ساتھ وابستہ کر کے ایک تصوراتی منطقی تعلق تلاش کیا جاتا ہے اور بعض مسلم ممالک کی مثال دے کر اس مفروضہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ مصر اور الجزائر کو خصوصاً بطور مثال پیش کیا جاتا ہے کہ سادات کے قتل کا سبب مسلح بغاوت کے ذریعہ اسلامی ریاست کے قیام کا خواب تھا یا الجزائر میں ۹۰ کی دہائی میں جو قتل وغارت ہوا وہ مسلح قوت کے ذریعہ اسلامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ریاست کے قیام کی کوشش تھی۔

اس قسم کے دعوے کرتے وقت تحقیقی دیانت کے تمام اصولوں کو نظرانداز کرتے ہوئے یہ بات فراموش کردی جاتی ہے کہ سادات کے حوالہ سے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ اور مصر اور اسرائیل کی قربت کا اس سانحہ میں کیا کردار تھا یا FAS نے لوکل باڈیز میں اعلیٰ درجے کی کامیابی کے لیے کون سا ''مسلح دستہ'' استعمال کیا تھا۔ اس کے برعکس جب فاس کی جمہوری ذرائع سے برسر اقتدار آنے کی امید پیدا ہوئی تو وہ ممالک جو صبح شام جمہوریت کی تسبیح پڑھتے نہیں تھکتے اور جو خصوصاً عالم عربی میں اس کی درآمد'' کو اپنا ''الہامی فریضہ'' اور مقدس مشن'' قرار دیتے ہیں انہی ممالک بلکہ اس ملک نے جو یک قطبی قوت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے الجزائر میں ہونے والے جمہوری عمل کے اسقاط کے لیے فوج کا بے شرمانہ استعمال کو حلال کیا اور ملک میں ہونے والے جمہوری عمل کو پیچھے کی طرف لوٹا دیا۔ آج تک الجزائر جمہوریت سے محروم ہے اور اس محرومی کی ذمہ داری صرف یک قطبی قوت پر عائد ہوتی ہے۔

اس جملہ معترضہ کو یہیں پر چھوڑتے ہوئے ہم چاہیں گے کہ اصل مسئلہ کی طرف آیا جائے یعنی یہ دیکھا جائے کہ کیا واقعی جہاد کا مقصد مسلم اور غیر مسلم دنیا پر ''شریعت'' کو ''مسلط'' کرنا ہے؟ یہ بات مغربی مصنفین خصوصاً Gould کے مقالہ میں شدومد سے کہی گئی ہے: "Thus many Muslims believe that they are obliged to impose this order" (p.27).

یہ بات کہتے وقت شریعت کا ایک رنگ آمیز مخصوص مفہوم سامنے رکھا جاتا ہے جس میں دوسرے مذاہب کے افراد کو مذہبی آزادی اور اپنی تہذیب اور رسومات کی ادائیگی سے محروم کرکے زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حقیقت حال اس سے بہت مختلف ہے۔ نظری حیثیت سے قرآن کی سیاسی تعلیمات میں غیر مسلموں کو نصوص کی شکل میں مذہبی اور ثقافتی آزادی کا تحفظ دیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان گروہ شریعت کا نفاذ چاہتا ہو تو اس کے لیے قرآن کے نصوص کے خلاف پالیسی بنانا ایک اصطلاحی تضاد کی حیثیت رکھے گا۔ عملی زاویہ سے دیکھا جائے تو غیر مسلم اکثریتی ممالک میں مسلمان مفکرین نے شریعت کے نفاذ کا مفہوم کبھی یہ نہیں لیا کہ وہاں پر خونی انقلاب کرکے شریعت مسلط کردی جائے بلکہ ایک جانب مسلمانوں کو یہ یاددہانی کراتے رہے کہ وہ اپنے معاملات کو شریعت کے مطابق سرانجام دیں مثلاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکاح، طلاق، میراث کے حوالے سے اسلامی احکام کی پیروی کی جائے اور سودی کاروبار سے اجتناب وغیرہ اور دوسری طرف اسلام کے دعوتی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے یہ بات کہتے رہے کہ اگر ایک طویل دعوتی عمل کے نتیجے میں غیر مسلم برضا و رغبت اسلام قبول کرنے کے بعد اسلامی تعلیمات کو اپنے ملک میں نافذ کرنا چاہیں تو دستوری اور جمہوری ذرائع ہی کو استعمال کیا جائے۔ قوت و تشدد کے استعمال کو ہمیشہ روکنے کی کوششیں کی گئیں۔

امریکہ یا برطانیہ کے چند گنے چنے یونیورسٹی کیمپس پر اگر حزب التحریر کے بعض جوشیلے نوجوانوں نے کسی اجتماع یا پوسٹر میں یہ دعویٰ کیا کہ وہ امریکہ یا برطانیہ میں خلافت کا نفاذ کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح کے انفرادی اور محدود عمل کو امت مسلمہ کی فکر نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ یہ اس کی غالب فکر کی نمائندگی کہی جا سکتی ہے۔ ایک مسلم ملک میں بھی جہاں ۹۷ فی صد آبادی مسلم ہو اسلامی ریاست غیر مسلموں کے شخصی، مذہبی اور ثقافتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتی اور نہ ان پر شریعت کو impose یا مسلط کر سکتی ہے لیکن یہ بات بھی نہ صرف عدل کے منافی بلکہ مضحکہ خیز ہو گی کہ ۳ فی صد آبادی کا دل رکھنے کے لیے ۹۷ فی صد آبادی اپنی دینی، ثقافتی، علمی، قانونی اور ابلاغی روایات و نظریات کو ملک میں نافذ نہ ہونے دے۔ مغربی سیکولر جمہوریت تو ۵۱ فی صد کی رائے کا احترام کر کے جو چاہے مسلط کر دے اور مسلم ممالک کے ۹۷ فی صد عوام کی خواہشات اور مطالبات کو محلّہ والوں کی دل شکنی کے خیال سے نافذ نہ کرنا ظلم کی بدترین شکل اور جمہوریت کے ساتھ گھناؤنا مذاق ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر مغرب کی سیکولر صہیونیت ۹۷ فی صد عوام کی رائے کے مقابلہ میں ۳ فی صد اقلیت کو زیادہ اہمیت دیتی ہے تو یہ اس کی عقل کا فتور ہے۔ خود مغربی جمہوریت کے اصول یہ تقاضا کرتے ہیں کہ اگر پاکستان یا کسی اور مسلم ملک میں ۹۷ فی صد عوام شریعت کا نفاذ چاہتے ہوں تو اسے شریعت کا impose کرنا نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اگر ۳ فی صد کی بنا پر شریعت نافذ نہ کی جائے تو یہ عمل اہل ایمان پر لادینیت کا impose کرنا ضرور کہا جا سکتا ہے۔

جہاد کے حوالے سے یہ ہوائی بھی اڑائی جاتی ہے کہ یہ جنت کے حصول کا ایک مختصر راستہ short cut ہے اور بہت سے افراد کے لیے جو اپنی ماضی کی زندگی میں اسلام پر عامل نہ رہے ہوں ایک آسان ذریعہ نجات ہے۔ نظری طور پر ممکن ہے اس خیال میں کوئی منطقی صداقت پائی جاتی ہو لیکن عملاً جن لوگوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے آج تک یہ راستہ اختیار کیا ہے ان میں تین نمایاں مثالیں مسلم دنیا سے دی جا سکتی ہیں۔ اولاً، فلسطینی نوجوانوں کا جہاد میں قربانی پیش کرنا چاہے بعض مغربی مصنفین کو short cut نظر آتا ہو لیکن عملاً یہ ایک طویل تر داستانِ کرب و ابتلاء کا محض ایک باب ہے۔ جس قوم کو ۵۸ سال تک اس کی بنیادی آزادی، اپنی زمین کی ملکیت، اپنے دین کی تعلیمات پر عمل سے محروم کیا گیا ہو اور وہ جہاد پر اتر آئے تو کیا اسے short cut کہنا حق و انصاف سے کوئی مناسبت رکھتا ہے؟ عراق میں ایک بیرونی ملک کے جابرانہ اور سفاکانہ قبضہ کے بعد اگر عراقی عوام قابض فوجوں اور ان کے حمایتوں کے خلاف مسلح جہاد کریں تو عقلی طور پر اپنی جان، اپنی ملکیت اور اپنی آزادی کا بچاؤ کرنا ان کا انسانی اور بنیادی حق ہے۔ اسے دہشت گردی کہنا عدل و انصاف کے عالمی پیمانوں کا مذاق اڑانا ہے۔ بالکل یہی شکل مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی ہے جس طرح فلسطینیوں کی قسمت سے کھیلا گیا اور وقت کی ایک طاقت نے ۱۹۴۸ء میں ایک ایسے خطہ کو جس پر اس کی حکومت بھی نہیں تھی ایک ایسی نسل پرست قوم کے حوالے کر دیا جو اس سرزمین کی اصل مکین نہ تھی اور نتیجتاً فلسطین کے اصل باشندوں کو جو وہاں صدیوں سے مقیم تھے اپنے آبائی گھروں سے بے دخل کر دیا گیا، بالکل اسی طرح مقبوضہ کشمیر کے عوام اور زمین کو جس پر برطانیہ کا قبضہ دستوری قبضہ نہ تھا ایک تیسرے فرد کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی، ظلم، استحصال، اور غلامی کے خلاف ایک جہاد کی حیثیت رکھتی ہے اور جب تک ان کے بنیادی انسانی حقوق حاصل نہ ہو جائیں ان کی جدوجہد آزادی کو شدت پسندی یا دہشت گردی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس جدوجہد آزادی کو وہ چاہے کشمیر میں ہو یا عراق میں یا الجزائر میں، خودکش حملہ یا حصول جنت کے لیے ایک short cut ذریعہ کہنا عقل و ہوش اور حق و انصاف سے کوئی مناسبت رکھتا ہے؟

چلتے چلتے ایک نکتہ یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ جہاد کا تصور نظری طور پر W.M.D یا توڑ پھوڑ کے لیے اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ شاید یہ دانشورانہ بات کہتے وقت اس کے محرک یہ بھول جاتے ہیں کہ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کا سبب اسلام کا تصورِ جہاد نہیں تھا بلکہ لادین جمہوریت کی تسبیح پڑھنے والی ریاست کا توسیع پسند ذہن تھا۔ خود عراق کے پس منظر میں صدام کو ایران کے خلاف صف آراء کروانے کے لیے مکمل حمایت اور مدد کرنے والا نہ کوئی القاعدہ کا قائد تھا نہ کسی مسلم ملک کا مفتی اعظم بلکہ یک قطبی قوت کا معاشی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفاد اور واضح طور پر تیل کے ذخائر پر قابض ہونے کی خواہش تھی۔

دورِ جدید میں جہاد کے حوالے سے جو بے شمار غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور جنہیں نہ صرف مغربی ابلاغ عامہ سیاسی مبصرین اور مستشرقین اپنی تحریرات کی زینت بناتے ہیں بلکہ بہت سے سادہ لوح مسلمان اور تاریخ سے لاعلم مسلم فرمانروا بھی مغربی میڈیا کے نقار خانے کی لے کے ساتھ لے ملا کر جہاد پر تبرّیٰ کر کے اپنی نام نہاد معصومیت کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ امریکی دانشور دوٹوک انداز میں مسلم دنیا پر قابض انہی فوجی حکمرانوں کو براہ راست دہشت گردی کے پیدا ہونے کا سبب گردانتے ہیں۔ گو مغرب اپنے مفاد کی بنا پر یہ سب کچھ جاننے کے باوجود ایسے فرمانبرداروں کی فوجی آمریتوں کو سالہا سال تک نظر انداز ہی نہیں کرتا بلکہ انہیں اپنا قابل اعتماد دوست کہنے سے بھی نہیں شرماتا۔

قرآن کا تصور جہاد ایک اصلاحی عمل ہے جو ظلم، قتل و غارت اور استحصال کو ختم کرنے اور امن، سلامتی، عدل و انصاف کے قیام کے لیے ہاتھ، زبان اور دل و دماغ کے استعمال کو اور اپنی جان اور اپنے مال کی بازی پر لگا دینے کو ایک انسانی فریضہ قرار دیتا ہے۔ یہ قرآنی تصور حقوق انسانی کی بحالی اور محکوم اقوام کو آزادی دلانے کے لیے قوت کے استعمال کو ایک اخلاقی فریضہ قرار دیتا ہے اور بغیر کسی معذرت کے اس کی عظمت کا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں وہ لوگ جو سجود و رکوع کرنے کے مقامات پر مصروف عبادت رہتے ہیں اور وہ جو میدانِ کارزار میں اپنے مال اور جان کی بازی لگاتے ہیں برابر نہیں ہو سکتے۔ وہ جہاد کرنے والوں کے عمل کے لیے ''اعظم درجہ'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اگر معروضی طور پر غور کیا جائے تو قرآن کریم کا جہاد کے بارے میں یہ غیر معذرت پسندانہ، شفاف، عقلی اور مصلحانہ تصور ہی انسانیت کو فلاح، امن، تحفظ، نجات، عدل و انصاف اور حقوق انسانی کے احترام سے روشناس کرا سکتا ہے۔ جہاد وہ ضمانت فراہم کرتا ہے جس کی بنا پر فتنہ و فساد، طاغوت اور مکر و فریب لرزہ براندام رہتا ہے اور انسانیت جھوٹ اور دھوکہ سے نجات حاصل کر کے عافیت و ترقی پذیری کی راہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔

© rasailojaraid.com